© rasailojaraid.com



پروفیسر خالد شبیر احمد    قسط: ۳۸

# ورق ورق زندگی

## اشتراکیوں سے معرکہ آرائی:

بہاول پور قیام کے دوران اشتراکی دوستوں سے خوب بحث و تمحیص بھی ہوتی رہی۔ ایک بار کالج کے دوستوں نے مجھ سے کہا کہ اردو کا ایک پروفیسر رشید الزماں تبدیل ہو کر ہمارے کالج میں آ رہا ہے۔ وہ جس کالج میں جاتا ہے اشتراکیت کا مبلغ بن کر جاتا ہے اور دین واہلِ دین کے خلاف ایک مہم شروع کر دیتا ہے۔ اس نے کئی کالجوں میں یہ کام بڑی کامیابی کے ساتھ سرانجام دیا ہے۔ میں نے جواباً دوستوں سے کہا کہ اُسے آنے دو دیکھا جائے گا۔ ایک دن وہ صاحب شعبۂ اردو میں تبدیل ہو کر آ گئے اور طیب صاحب کے کمرے میں ہمارے ساتھ بیٹھنا بھی شروع کر دیا۔ انتہائی ملنسار، دھیمے انداز میں بات کرتے اور پھر اس کے علاوہ اپنے مشن کے بڑے پختہ پرچارک بھی تھے۔ اٹھتے بیٹھتے کوئی نہ کوئی ایسی دین مخالف بات کر جاتے جس کا جواب دینا ضروری ہوتا۔ جب اُنہیں اُن کی بات کا من توڑ جواب میری طرف سے ملتا تو مجھے دوستوں سے بہت داد ملتی۔ کچھ وقت گزرا تو انھوں نے کالج کی کنٹین اور شہر کے مختلف ہوٹلوں میں اپنے چنیدہ طلباء کو اشتراکیت پر تبلیغی لیکچر دینے شروع کر دیے۔ مجھے اس کی اطلاع ملی تو میں نے بھی اپنے کمرے میں اپنے چند طلباء جن سے مجھے اُنس تھا اور جو میرے قریب تھے یا مجھے اپنے پسندیدہ اساتذہ میں شمار کرتے تھے، اکٹھے کرنے شروع کر دیے اور ایک خصوصی پیریڈ شروع کر دیا۔ یہ پیریڈ جب کالج کا وقت ختم ہو جاتا تھا تو پڑھا جاتا تھا۔ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''اُمّ الکتاب'' انھیں سبقاً پڑھانا شروع کر دی اور ساتھ ہی اشتراکیت کے دین دشمن فلسفے کے دلائل اور ان کے محاکے سے بھی روشناس کرانا شروع کر دیا۔ رشید الزماں کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ ایک دن میرے کمرے میں آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ یار خالد شبیر یہ تم کالج ٹائم کے بعد کون سا پیریڈ لیتے ہو۔ میں نے جواباً کہا یہ وہی پیریڈ ہے جو تم اشتراکیت پر کبھی کالج کنٹین میں اور کبھی شہر کے کسی ہوٹل میں لیتے ہو۔ تم اپنے طلباء تیار کر رہے ہو اور میں تمھاری محنت کے خلاف اپنے طلباء تیار کر رہا ہوں۔ میرے یہ طالب علم تمھارے ان برین واشڈ بچوں سے اُلجھیں گے اور ادھر تمھاری ٹائی میرے ہاتھ ہوگی اور میرا گریبان تمھارے ہاتھ میں، نہ میں یہاں سیاسیات پڑھا سکوں گا نہ تم اردو۔ تمھیں خالد شبیر سے واسطہ پڑا ہے اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ایک دن کالج میں ایسا ہنگامہ ہوگا کہ دنیا دیکھے گی۔ یہ سن کر اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور ان سرگرمیوں میں خاصی کمی آ گئی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد کالج کے میگزین میں اُس کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں دین واہلِ دین کی تحقیر واستخفاف کیے گئے تھے۔ کالج کے سبھی دین دار اساتذہ نے اس مضمون پر سخت احتجاج کیا۔ پرنسپل صاحب کو شکایت پہنچانے کے لیے ایک وفد ملا جس کی قیادت میں ہی کر رہا تھا۔ انھوں نے اس سلسلے



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



میں ایک کمیٹی تشکیل دی جو اس بات کی تحقیق کرے کہ کیا یہ مضمون دین کے خلاف ہے؟۔ اس پر مزید غضب یہ ہوا کہ اس تحقیقاتی کمیٹی کا انچارج خود پروفیسر رشید الزمان کو بنا دیا گیا۔ میں انتہائی غصے کی حالت میں پرنسپل صاحب کے پاس گیا اوران سے احتجاج کیا۔ اس کے جواب میں پرنسپل صاحب نے مجھے کہا کہ: ”خالد شبیر صاحب! رواداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے، کالج چلانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگر تم بھی میری جگہ پرنسپل ہوتے تو ایسے حالات میں یہی کرتے جو میں نے کیا ہے۔“

میں نے جواباً صرف ایک ہی فقرہ عرض کیا: ”جناب پرنسپل صاحب! جسے آپ رواداری کہہ رہے ہیں آپ کے خیال میں یہ رواداری ہوگی۔ دینی نقطۂ نگاہ سے اسے دیوّثی اور بے غیرتی کہتے ہیں۔“

بالآخر ہمارا احتجاج رنگ لایا اور انجامِ کار پروفیسر رشید الزمان کو اس کمیٹی کی صدارت سے علیحدہ کیا گیا اور انھیں تحریری طور پر وارننگ بھی دی گئی۔

**پرنسپل جی۔ ایم دین مرزا:**

ایک دن طیّب صاحب کے کمرے میں ہی دوستوں کی زبانی معلوم ہوا کہ پروفیسر جی۔ ایم دین مرزا نئے پرنسپل کے طور پر کالج میں آرہے ہیں۔ مرزا صاحب اُس زمانے کا معروف دہشت ناک کیرکٹر تھے۔ اپنے مزاج اور اُفتادِ طبع کی بدولت کبھی کسی ایک جگہ ٹک کے سروس نہیں کر سکے۔ موصوف جس کالج میں جاتے تھے اکیلے ہی جاتے صرف ایک سوٹ کیس ان کے ساتھ ہوتا تھا کہ اُنھیں اس بات کا علم تھا کہ چار یا پانچ ماہ کے بعد میرا تبادلہ کسی دوسرے کالج میں ہو ہی جائے گا۔ ہرنئی جائے ملازمت پر اُن کی شہرت اُن کی پیشوائی کرتی تھی۔ موصوف بڑے ٹھسّے دار سوشلسٹ تھے۔ نڈر، بے دین اور بڑی بے باکی کے ساتھ دین کے خلاف بات کرنے کی عادی اور شوقین۔ تمام پروفیسر اس خبر کو سن کر پریشان ہوئے۔ ایک دوست مجھے کہنے لگے خالد شبیر اب تم کیا کرو گے؟ ہمارے لیے تو اُن کی آمد ایک مسئلہ ہے سو ہے تمھارے لیے تو یہ ایک بڑی آزمائش اور امتحان بن جائے گا۔ میں نے جواب میں کہا کہ آپ اُنھیں اتنا نہیں جانتے جتنا میں ان سے واقف ہوں۔ وہ خاصے منہ پھٹ اور بے لحاظ مشہور ہیں، اپنے آپ کو پاکستان پیپلز پارٹی کا فونڈر ممبر قرار دیتے ہیں، ملتان شہر میں انھوں نے اپنے جذبۂ اشتراکیت کی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ خاص طور پر جب ایوب خان صاحب کے خلاف تحریک کالج کے طلباء کے ہاتھ میں تھی تو ان تمام طلباء کو ہدایات جی۔ ایم دین مرزا کے ہاں سے ملتی تھیں۔

جماعت اسلامی کے لوگ اُن کی بدنام زمانہ حرکتوں کی وجہ سے اُنھیں نشانے پر رکھتے تھے، وہ جہاں جاتے ان کے خلاف ایک مہم چلا دیتے اور انھیں اس کالج سے تبدیل ہونا پڑتا تھا۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم نے بھی ان کے خلاف ایک اداریہ لکھا تھا، جو میری نظر سے گزر چکا تھا۔ بہرحال ہمارے نئے پرنسپل صاحب جی۔ ایم دین مرزا صاحب آئے اور پہلے ہی دن انھوں نے اپنی ذات سے وابستہ خدشات سچ کر کے دکھانے شروع کر دیئے۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تمام کالج کے طلباء کو کالج گراؤنڈ میں اکٹھا کیا گیا کہ پرنسپل صاحب طلباء سے خطاب کریں گے اور تمام سٹاف کی حاضری بھی ضروری قرار دی گئی۔ چنانچہ سب کے سامنے پرنسپل صاحب کا یہ خطاب شروع ہوا:

''میں آپ تمام لوگوں کو جو یہاں پر تشریف رکھتے ہیں خواہ وہ طلباء ہیں یا کالج کے اساتذہ ہیں، بتانا چاہتا ہوں کہ میں اشتراکی ہوں، ایک انقلابی ذہن کا مالک۔ میں نے ملتان میں ایوب خان کے خلاف طلباء سے تحریک چلوائی تھی۔ اور وہاں جب کاروں کی آگ لگائی گئی تو طالب علموں کو دیا سلائی بھی میں نے ہی دی تھی۔ میرے سامنے کمشنر اور ڈی۔ سی سب کی زبان گنگ ہو جاتی ہے اس لیے کہ میں انقلابی ہوں۔ میں آج آپ کے سامنے گفتگو اسی لیے کر رہا ہوں کہ میرے بارے میں کسی کو کوئی غلط فہمی نہ رہے۔ میرے علم میں ہے کہ اس کالج میں جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے بھی کچھ پروفیسر حضرات ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مردہ قومیں ماضی کی طرف دیکھتی ہیں۔ زندہ قومیں مستقبل پر نگاہ رکھتی ہیں۔ ہمارے ماضی کے دامن میں سوائے اندھیرے کے اور دھرا ہی کیا ہے؟ میں نے ایک ''سپینش آتھر'' کی کتاب بھی پڑھی ہے اور اس میں بھی یہی لکھا ہوا تھا کہ مردہ قومیں ماضی کی طرف دیکھتی ہیں، زندہ قومیں ماضی فراموش ہوتی ہیں۔''

یہ اول جلول بھاشن میں نے بھی سنا۔ جب کلاس میں آیا تو کچھ طالب علموں نے بھی اس گفتگو کا لایعنیت کو محسوس کرتے ہوئے اس پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا۔ میں نے اپنے طالب علموں سے کہا مختصر تو یہ ہے کہ پرنسپل صاحب کی تقریر انتہائی قابلِ اعتراض ہے۔ خاص طور پر جبکہ مارشل لا اتھارٹی کی طرف سے ایک نوٹس آیا ہوا ہے کہ کالجوں میں کوئی سیاسی تبلیغی مہم نہیں چلائی جائے گی۔ اس تقریر کا مفصّل جواب جلد ہی آپ کو مل جائے گا۔ ذہن تو میں نے اس وقت ہی بنا لیا تھا لیکن رات کو مجھے نیند نہ آئی، مرزا صاحب کی ساری تقریر میرے ذہن میں گھومتی رہی اور اُن کے اوٹ پٹانگ جملے میرے ذہن میں تازہ ہوتے رہے۔ کہ یہ بھی کہا تھا اور وہ بھی کہا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ وہ ایک بے دین ہے، اس نے کفر کی جاہلیّت کا دفاع کرنے میں کسی جھجھک کا مظاہرہ نہیں کیا تو مجھے حق کی بات کرتے ہوئے کیوں خوف آئے۔ مجھے اُس کی تقریر کا جواب دینا چاہیے اور ضرور دینا چاہیے۔ میں بھی امیر شریعت کی جوتیوں میں بیٹھا ہوں اور اگر آج میں نے اس آدمی کی تقریر کا جواب نہ دیا تو روزِ قیامت اُن قدسی صفت بزرگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا جنھوں نے اپنی شفقتوں سے میری تربیت کی۔ دوسرے دن میں کالج گیا حسبِ توقع دوستوں میں اسی تقریر کا ذکر ہو رہا تھا۔ میں نے وہاں پر دوستوں کے درمیان اعلان کیا کہ میں پرنسپل صاحب کی اس تقریر کا جواب دوں گا۔ میں آج کالج کے بعد شعبہ سیاسیات کا صدر ہونے کی حیثیت میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر مولانا احمد سعید کاظمی کی تقریر کا اعلان کر رہا ہوں۔ (یاد رہے کہ ہمارے کالج کے ساتھ ہی جامعہ اسلامیہ، بہاولپور تھی۔ جس میں کاظمی صاحب برسرِ کار تھے۔ میں گیا تو تھا حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ سے وقت مانگنے لیکن وہ جامعہ میں نہیں تھے تو جناب مولانا احمد سعید کاظمی سے درخواست کی) ابھی ایک نوٹس تمام کلاستوں میں بھجوا رہا ہوں اور کالج ٹائم کے بعد



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تقریب ہوگی۔ آپ تمام حضرات کو بھی دعوت ہے، پروفیسروں کے لیے الگ دعوت دی جائے گی۔ میری بات سن کر میرے دوست حیران بھی ہوئے بعض نے مجھے سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ اس کا نتیجہ تمھارے لیے برا بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے ہر خطرہ منظور ہے مگر پرنسپل صاحب کو جواب ضرور دیا جائے گا۔ چنانچہ کالج کلاسز کا دورانیہ ختم ہونے کے بعد کالج میں تقریب شروع ہوئی۔ جناب مولانا احمد سعید کاظمی نے کرسیِ صدارت سنبھالی۔ تلاوت ہوئی، میں نے ایک پروفیسر رحمت اللہ صاحب کو پرنسپل کے دفتر بھیجا کہ جایئے اور پرنسپل صاحب سے کہیں کہ تقریب سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو رہی ہے اس میں تشریف لائیں۔ کچھ دیر کے بعد پروفیسر رحمت اللہ شاہ صاحب واپس آئے اور کہنے لگے کہ میں نے پرنسپل صاحب کو تقریب میں شامل ہونے کے لیے کہا تھا۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ''میرا سیرت سے کیا تعلق؟''

میرا جی تو چاہتا تھا کہ پرنسپل صاحب سامنے ہوتے تو میں منہ در منہ بات کرتا لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں نے مولانا صاحب سے پہلے اپنی گفتگو شروع کی۔ چند باتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے بیان کرنے کے بعد میں نے کہا کہ ''سیرت پر مفصل بیان تو علامہ احمد سعید کاظمی صاحب کا ہی ہوگا۔ جنھوں نے میری دعوت کو قبول فرمایا اور یہاں پر تشریف لائے۔ میں اُن کا ممنون ہوں، لیکن اُن سے پہلے میں اپنے نئے پرنسپل جناب جی۔ ایم دین مرزا صاحب کی کل کی تقریر کا جواب دینا اخلاقی، قانونی اور دینی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ انھوں نے پہلی بات یہ کہی کہ مردہ قومیں ماضی کی طرف دیکھتی ہیں زندہ قومیں مستقبل کو اپنے سامنے رکھتی ہیں۔ پھر انھوں نے بڑی جسارت سے یہ بھی کہا کہ ہمارے ماضی میں سوائے اندھیرے کے اور رکھا ہی کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں بہت بڑا انقلابی ہوں۔

اُنھیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ تاریخِ انسانی میں سب سے بڑے انقلابی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ اور ان کے بعد جو بھی اپنے کردار واعمال کی نسبت سے جتنا اُن کے قریب ہوگا اُتنا انقلابی ہوتا جائے گا۔ لہٰذا ہمارے نئے پرنسپل چونکہ اپنے کردار واعمال کی نسبت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوسوں دور ہیں لہٰذا میں اُنھیں سرے سے انقلابی ہی نہیں مانتا۔ اُن کے اس اعلان کی میرے نزدیک اور کوئی حیثیت نہیں ایک مجذوب کی بڑ ہے۔

اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ مردہ قومیں ماضی کی طرف دیکھتی ہیں زندہ قوموں کی نگاہ اپنے مستقبل پر ہوتی ہے۔ وہ بڑے اشتراکی بنتے ہیں اور انہیں تو اپنے اشتراکی ہونے پر بڑا ناز ہے لیکن اُن کے مطالعے کا یہ حال ہے کہ اس صدی کے سب سے بڑے اشتراکی ماؤزے تنگ نے اپنے ماضی کو پڑھ کر ہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ کبھی ایک زندہ قوم تھے۔ اور آج سوائے افیون کھانے افیون بیچنے اور افیون پیدا کرنے سرمایہ دار کے ڈیروں سے جوتیاں کھانے کے ہمارے دامن میں اور کچھ نہیں ہے۔ یہ ماضی اور حال کا تقابل ہی اسے ان کے خیال کے مطابق اچھے مستقبل کی طرف لے گیا۔ جناب پرنسپل صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے سپین کے ایک مصنف کی کتاب پڑھی تھی اُس میں بھی یہی لکھا ہوا تھا کہ مردہ قومیں ماضی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کی طرف دیکھتی ہیں۔ میں جناب پرنسپل صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سپین کے ماضی میں مسلمانوں کی غلامی کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ وہ تو یہ کہہ سکتے ہیں مگر ہم نہ ہی تو مردہ قوم ہیں اور نہ ہی ہمارا ماضی اتنا گھناؤنا ہے جتنا سپین کا ہے۔ ہمارا ماضی روشن اور درخشندہ ہے اور یہ ہمارا ماضی ہے جو ہمیں اپنے روشن مستقبل کی طرف لے جا سکتا ہے۔

ہمائے نئے پرنسپل صاحب نے نہ جانے کس طرح ہمارے ماضی کو اندھیرا کہہ دیا۔ اُن کی کل کی ساری تقریر میرے نزدیک دیوانے کا خواب ہے میں اپنے ماضی کے حوالے بطور مثال صرف پچھلی ایک دو صدیوں پر محیط رہوں تو اس ماضی میں کیسے کیسے لوگ ہماری قوم میں پیدا ہوئے۔ کیا وہ سب اندھیرا تھے۔ کس منہ سے انھیں اندھیرا کہہ دیا۔ حریت پسندوں میں کیا سلطان ٹیپو شہید اندھیرا تھے؟ شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی کیا سب اندھیرا تھے؟ کیا امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری جنھوں نے اپنی پوری زندگی تحریک آزادی کی نذر کر دی، اندھیرا تھے؟ کیا شورش کاشمیری اندھیرا تھے؟ ہمارے پرنسپل صاحب کو آغا صاحب کی کتاب پس دیوارِ زنداں پڑھنی چاہیے تاکہ اُنھیں معلوم ہو کہ انقلاب کے نعرے لگانے کا چارم اور انقلاب کے راستے میں خود چلنا بلکہ قیادت کرتے ہوئے قربانیاں دینا کتنا مختلف ہوتا ہے۔ یہ لوگ اصل انقلابی تھے جنھوں نے آدھی آدھی زندگیاں جیل میں گزار دیں لیکن انگریز سلطنت کے خلاف جہادِ حریت جاری رکھا۔ انھیں اندھیرا کہنے والا خود اندھیرے کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا آج اپنے زخم چاٹ رہا ہے۔ ہمارے پرنسپل صاحب کو یہ زعم ہے کہ وہ یہاں جو چاہیں گے کریں گے۔ ہم کسی صورت ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ مجھے بخوبی ادراک تھا کہ میری تقریر پرنسپل صاحب کے لیے دعوتِ مبارزت کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں جب بول رہا تھا تو میرے دوست میری پینٹ کھینچ رہے تھے اور مجھے حساس دلا رہے تھے کہ تقریر ختم کرو۔ لیکن میں ایک اور ہی کیفیت میں تھا جو ذہن میں آ رہا تھا دھڑلے سے کہے جا رہا تھا۔ بعد میں علامہ احمد سعید کاظمی نے تقریر کی اور اچھے انداز میں میری تقریر کی تائید بھی کر دی۔ تقریب ختم ہوئی تو سب دوست طیب صاحب کے کمرے میں چلے آئے اور چائے کی پیالی پہ میری یہ حرکت زیرِ بحث آئی۔ سب کا کہنا تھا کہ خالد شبیر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب ہمارے اس دوست کی یہاں سے ٹرانسفر ہونے والی ہے۔ ایک دوست کہنے لگے کہ مارشل لا لگا ہوا ہے اور معاملہ مارشل لا کورٹ میں بھی جا سکتا ہے۔ لیکن میں مطمئن تھا۔ میں نے کہا کہ آپ دیکھتے جائیں معمولی سا ہنگامہ ہوگا اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے کچھ ناروا نہیں کیا، وہی کہا ہے جو کہنا چاہیے تھا۔ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے کہ وہ میرے ساتھ ہے پرنسپل کے ساتھ نہیں ہے۔

دوسرے دن جب میں کالج آیا تو کالج کا چپڑاسی گھبرایا ہوا میرے پاس آیا کہ پرنسپل صاحب دو تین مرتبہ آپ کے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔ خالد شبیر صاحب، ''صاحب'' تو بڑے غصے میں ہیں۔ میں نے اُسے تسلی دی اور کہا فکر مت کرو کچھ نہیں ہوگا۔ میں پرنسپل کے دفتر میں گیا تو چپڑاسی نے کہا کہ خالد شبیر آ گئے ہیں۔ پرنسپل صاحب نے میری طرف



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



دیکھا اور کہا تم خالد شبیر ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں میں ہی خالد شبیر ہوں۔

تم نے کل میرے خلاف تقریر کی ہے۔

میں نے جواباً کہا: ''میں نے آپ کے خلاف تقریر نہیں بلکہ اپنی دینی اقدار و اسلاف کے تحفظ میں تقریر کی ہے اگر آپ کو میرے معتقدات، اسلاف و اقدار کے خلاف تقریر کرنے کا حق ہے تو مجھے اس کے دفاع کا حق آپ سے زیادہ ہے۔ وگرنہ میرا آپ سے ذاتی عناد ہے کہ آپ کے خلاف تقریر کرتا؟

پرنسپل صاحب کہنے لگے: ''کیا تم مجھے نہیں جانتے۔''

میں نے جواب میں کہا آپ کو بھلا کون نہیں جانتا، آپ تو اپنے مخصوص افکار کی وجہ سے پورے پنجاب میں مشہور ہیں۔ آپ کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں، آپ کی ملتان کی سرگرمیاں میرے سامنے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ آپ مجھے نہیں جانتے۔ پرنسپل صاحب نے کہا کہ میں تمھیں نہیں جانتا تو اب جان لوں گا۔ اس کے بعد کہنے لگے تمھیں علم نہیں کہ میں سکہ بند سوشلسٹ ہوں اور پاکستان پیپلز پارٹی کا بانی رکن ہوں۔ جس جگہ اور جس کنونشن میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی میں بھی اُس کنونشن میں موجود تھا۔

میں نے جواب میں کہا: ''مجھے اس سے کیا کہ آپ سوشلسٹ ہیں کہ نہیں اور آپ پیپلز پارٹی کے بانی رکن ہیں یا کہ نہیں۔ میری طرف سے آپ دہریے ہو جائیں، مجھے آپ کے معتقدات سے غرض نہیں، لیکن جس کرسی پر آپ بیٹھے ہیں اس کرسی پر بیٹھ کر سوشلزم کی تعلیم یا ترغیب دینے کا حق آپ کو کس نے دیا ہے؟''

اس بات پر وہ غصے میں بھڑک اُٹھے۔ کہنے لگے میں تمھیں مارشل لا کورٹ بھجوا سکتا ہوں۔

میں نے کہا کہ یہ شوق بھی آپ پورا کر لیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ میری ملاقات چیف مارشل لا ایڈمنسٹر جنرل یحیٰ خاں سے کروائیں کہ میں اُنھیں بتاؤں کہ آپ اپنی کرسی کس کام کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

اس پر وہ مزید گرم ہو گئے اور کہنے لگے کہ مجھے تم جماعت اسلامی کے معلوم ہوتے ہو؟

میں نے کہا کہ یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ آپ کا ابھی تک جماعت اسلامی سے واسطہ پڑا ہے میں جماعتِ اسلامی سے نہیں جماعتِ اسلام سے تعلق رکھتا ہوں۔ اور جماعت اسلامی اور جماعت اسلام کے درمیان اتنا فرق ہے جتنا مؤنث اور مذکر میں ہوتا ہے۔ بس پھر وہ آپے سے باہر ہو گئے اور انتہائی غصے میں چلّا کر کہنے لگے:

Get out from my office! I will see you.

میں نے کہا بس اتنا ہی حوصلہ تھا؟ میں آپ اور آپ کے دفتر دونوں پر تھوکتا ہوں، یہ کہا اور دفتر سے باہر آ گیا۔

اندر کمرہ میں اساتذہ کا مجمع تھا جو ہماری تو تو میں میں سن رہا تھا تو باہر برآمدے میں طلباء کا جمگھٹا ہماری باتوں



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں آ کے طیب صاحب کے کمرے میں بیٹھ گیا بعد میں دوستوں نے بتایا کہ پرنسپل صاحب ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے میرے بارے میں پوچھتے رہے۔ کہ یہ کون ہے، کس جماعت سے تعلق رکھتا ہے؟

جس پروفیسر سے بھی میرے بارے میں پوچھا، اس نے یہی کہا کہ آدمی تو اچھا ہے، بڑا متحمل مزاج اور خوش خلق ہے۔ لیکن ایک بات اس میں یہ ضرور موجود ہے کہ دین کے خلاف بات نہیں سُن سکتا۔ کسی جماعت سے تعلق تو نہیں ہے لیکن اکثر برملا کہتا ہے اور ہر ایک کو کہتا ہے کہ میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا مرید ہوں۔

ایک پروفیسر صاحب نے انھیں جواب میں یہ بھی کہا کہ اگر آپ اس آدمی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے چاہتے ہیں تو پھر آپ اپنے نزدیکی رشتہ دار راجہ ایف۔ ایم ماجد صاحب سے فون پر رابطہ کر لیں (ماجد صاحب میرے استاد اور مرزا صاحب کے برادرِ نسبتی تھے اور میرے پسندیدہ استادوں میں سرفہرست اور انتہائی معزز تھے۔ وہ اس وقت ملتان سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے چیئرمین تھے) اس پر مرزا صاحب نے فوراً ملتان راجہ ایف۔ ایم ماجد صاحب سے رابطہ کیا اور میرے بارے میں پوچھا کہ یہ خالد شبیر جو یہاں پر سیاسیات کا پروفیسر ہے یہ کون ہے اور کیسا آدمی ہے؟ اس نے میرے بے عزتی کی ہے، سنا ہے کہ تمھارا شاگرد ہے اس کے بارے میں بتاؤ، میں تو اسے نہیں چھوڑوں گا۔ جس پروفیسر نے مجھے یہ سارا قصہ سنایا وہ اس وقت پرنسپل صاحب کے ساتھ وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ راجہ ایف۔ ایم ماجد صاحب اللہ اُنھیں غریق رحمت فرمائے انھوں نے میرے بارے میں کچھ بہتر باتیں کیں جن جنکا خلاصہ یہ تھا کہ ”یہ چار سال تک میرا شاگرد رہا ہے اور میں اس کو بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ اگر آپ نے اس کے ساتھ جنگ کی تو یہ مر بھی گیا تو آپ کو بھی زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ میرا مشورہ آپ کو یہی ہے کہ اس کے ساتھ صلح صفائی کر لو۔ آپ کا یہ چند ماہ کا بہاول پور میں قیام پرسکون ہو جائے گا۔“

اللہ تعالیٰ کی اس غیبی مدد یعنی راجہ صاحب کے ان الفاظ کو سنتے ہی مرزا صاحب تبدیل ہو گئے۔ اس دن تو خیر اُن سے ملاقات نہ ہوئی لیکن دوسرے دن میرے اور اُن کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ نذرِ قارئین کرنا ضروری سمجھتا تا کہ پڑھنے والوں کو احساس ہو کہ جو بے خوف ہو کر اللہ کی بات کرتے ہیں اللہ اُن کی کیسے مدد کرتا ہے۔ دوسرے دن پرنسپل جی۔ ایم دین مرزا صاحب نے پھر بلوایا، میں گیا تو اچھے موڈ میں تھے کہنے لگے تشریف رکھیں۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا، اُن کا پہلا فقرہ یہ تھا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ کے عقیدت مندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے درست سنا ہے وہ میرے پیر و مرشد ہیں اور اُنھی کے نقش قدم پر چلنا میری کوششوں کا ڈھب ہے۔ کہنے لگے میں امیر شریعت کا بڑا احترام کرتا ہوں اور انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، انھوں نے برٹش امپریلزم کے خلاف بڑی بہادری سے جنگ لڑی ہے۔ میں نے کہا اچھی بات ہے کہ آپ امیر شریعت کے کام کا احترام کرتے ہیں۔ اس کے بعد کہنے لگے ”خالد شبیر میں آپ سے معذرت خواہ ہوں میں نے جو کچھ اس دن کہا مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ آپ کا ہی نہیں کئی دوسرے افراد کے دل بھی دکھے



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہوں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اس معذرت کو قبول کرتے ہوئے میرے ساتھ تعاون کریں گے۔“

میں نے جواب میں کہا: ”جناب پرنسپل صاحب مجھے آپ سے یہی امید تھی شاید آپ کو علم نہ ہو میں آپ کو نظم وضبط کے حوالے سے اچھا منتظم سمجھتا ہوں۔ مجھے ذاتی حیثیت میں آپ سے کوئی شکایت نہیں، اگر آپ اپنی اُس دن کی گفتگو پر شرمندگی کا اظہار کر رہے ہیں تو مجھے آپ ہمیشہ اپنے ساتھ پائیں گے۔ اس کے بعد میں نے اُن سے کہا کہ ”دیکھیے مرزا صاحب اب آپ کی اور میری تلخی دور ہوگئی ہے لیکن یہ نہ ہو کل آپ پھر کسی تقریب میں وہی سبق دہرادیں جو آپ نے پہلے دن سنایا تھا۔ اس دن تو میں نے بے غیرتی میں ایک دن اور ایک رات گزاری اب کی بار ایسا نہیں ہوگا، جہاں آپ اس قسم کی بات کہیں گے وہیں پر آپ کو ٹوکا جائے گا۔ پرنسپل صاحب نے قہقہہ لگا کر خوش مزاجی سے ہاتھ ملایا اور میں دفتر سے باہر آ گیا۔ طیب صاحب کے کمرے میں سب دوست میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اُنھیں پوری کہانی سنائی۔ سب بہت حیران ہوئے کہ یہ کیسے ہوگیا۔ میں نے جواب میں کہا اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ مجھ پر اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنا میں اٹھا سکتا ہوں۔ اور یہ جو کچھ میں کرتا ہوں اس کے لیے میں اپنے اسلاف اور جماعتِ احرار کا ممنونِ احسان ہوں کہ انھوں نے میری تربیت ایسی کر دی ہے کہ دین کا دفاع میرے خمیر میں شامل ہو گیا ہے۔ اللہ کے دین کی نصرت کی بات کہتے ہوئے مجھے کوئی خوف نہیں ہوتا۔ جماعتی ماحول نے خوفِ خدا تو پیدا کیا ہے دوسرا ہر قسم کا خوف مجھ سے دور بھاگ گیا ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ وہ شخص بھی ہو بزدل خالدؔ
جس کو نسبت ہو بھلا حلقۂ احرار کے ساتھ

اور پھر امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کا فیض بھی ہے۔ جن کا چہرہ ہر وقت میرے سامنے رہتا ہے اور جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو سوچتا ہوں کہ اگر میری جگہ امیر شریعت ہوتے تو پھر وہ کیا کرتے؟ دل جو جواب دیتا ہے وہ کر دیتا ہوں اور پھر اللہ تعالیٰ مدد کر کے حالات کو میرے حق میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اللہ پاک نے ہمیشہ لہجۂ احرار میں ہی بات کرنے کی توفیق بخشی ہے۔

ہم زینتِ فسانۂ جاناں بنے رہے
جذب و جنوں و عشق کا عنواں بنے رہے
زیرِ قدم رہا ہے حوادث کا سلسلہ
یوں جرأتوں کا شعلۂ پرّاں بنے رہے

جاری ہے



© rasailojaraid.com